دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

تحریر: سہیل احمد لون

نوے کی دہائی میں جرمنی میں ڈوچے مارک بطور کرنسی استعمال ہوتی تھی۔ اکثر ممالک میں نوٹوں پر چھپی تصویر اس ملک کے بانی ،بادشاہ یا ملکہ کی ہوتی ہے۔ مگر جرمن مارک کے پانچ، دس، بیس، پچاس اور سو کے نوٹوں پر مختلف تصویریں بنی ہوئیں تھیں۔ میں نے ایک دن اپنی جماعت کے تمام طالب علموں سے نوٹوں پر بنی تصویروں کے بارے میں دریافت کیا مگر کسی کو نہیں پتہ تھا کہ نوٹوں پر بنی تصویریں کن کو گوں کی ہیں؟ نوٹوں پر تو ان لوگوں کی تصاویر تھیں جو ماضی کا حصہ بن چکے ہیں یہاں کی نوجوان نسل تو اپنے حال میں ایسی مست ہے کہ وہ ''سیاسی حال'' سے بھی نا آشنا ہے۔ یورپ، برطانیہ سمیت مغربی ممالک میں بسنے والی نوجوانوں کی اکثریت کو ملکی سیاست سے کوئی خاص سروکار نہیں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی محفلوں میں ملکی سیاست کو زیر بحث بھی نہیں لاتے۔ 9/11 ورلڈ ٹریڈ سینٹر، 7/7 لندن بم دھماکے یا سپین کے شہر میڈرڈ میں دہشت گردی کے واقعات رونما ہوئے تو کچھ عوامی ردعمل دیکھنے میں آیا۔ یہاں محفلوں میں موضوع بحث ملک یا بین الاقوامی سیاست نہیں بلکہ روزمرہ کے دیگر معاملات ہوتے ہیں اگر کبھی سیاست پر بحث ہو بھی تو شخصیات پر نہیں بلکہ پالیسوں پر بات کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس وطن عزیز میں وزیراعظم سے چپڑاسی، آرمی چیف سے فوجی جوان، صنعت کار سے مزدور، چیف جسٹس سے منشی ،مرشد سے مرید، کھلاڑی سے تماشائی اور بدمعاش سے خوشحال تک ہر شخص ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں اپنی توانائی صرف کرتا نظر آتا ہے۔ حیرانگی اس بات پر ہے کہ سیاسی معاملات میں عوام کی بے پناہ دلچسپی کے باوجود ملکی سیاست.....سیاست کی نذر ہو رہی ہے۔ اب سیاست ایک کھیل بن چکا ہے جس میں کھلاڑی جتنا خودغرض، مکار، نااہل اور کرپٹ ہوگا اس کی باری اتنی لمبی ہوگی۔ سیاسی وباء کا اثر قومی کھلاڑیوں اور کھیل پر بھی پڑا ہے۔ کھلاڑی میدان میں کارکردگی جیسی بھی دکھائے مگر سیاسی چالیں چل کر ٹیم یا بورڈ کا حصہ بنا رہتا ہے۔ بعض کھلاڑیوں نے تو باقاعدہ سیاست میں حصہ بھی لے لیا ہے۔ میڈیا کا بنیادی کام عوام کو تفریح اور معلومات مہیا کرنا ہوتا ہے ہمارا میڈیا جب سے ''آزاد'' ہوا ہے عوام کو سیاست میں تفریح اور معلومات کا پیکیج ایک ساتھ مہیا کر رہا ہے۔ عوام کو اب سیاسی تفریح کی عادت ہوتی جا رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اب سنیما گھروں اور تھیٹروں کی جگہ ہوٹل اور پلازے بن چکے ہیں۔ ایسے بہت سے مقبول ہیرو، ہیروئین اور معروف اداکار جو کبھی چھوٹی سکرین پر آنا اپنی توہین سمجھتے تھے آج بڑے فخر سے ٹی وی پر ٹاک شوز اور مارننگ شوز کر کے اپنی روٹی روزی کمانے پر مجبور ہیں۔ جہاں وطن عزیز میں مسجد بھی سیاست سے محفوظ نہیں رہی تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میڈیا پر سیاسی وبا کا اثر نہ ہو۔ پیسہ لیکر خبر لگانا یا خبر چلانا .....پیسہ لینے کے لیے خبر لگانا یا خبر چلانا اب میڈیا کا بنیادی فارمولا ہے۔ یہ اتنا منافع بخش اور بارعب کاروبار بن چکا ہے کہ جسے صحافت کی اے بی سی کا بھی پتہ نہ ہو وہ بھی اے بی سی اخبار نکال کر موجیں مار رہا ہے۔ ابھی چند ہفتے قبل کچھ لفافہ مار کہ صحافیوں کا پول بھی کھلا مگر آج بھی وہ بڑی بے شرمی کے ساتھ اپنے صحافی ڈگڈگی بجا رہے ہیں۔ جہاں حقیقی جمہوریت ہے ان ممالک میں عوام کی اکثریت

کواپنے آرمی چیف کے نام کا پتہ نہیں ،اس کے برعکس ہم جمہوریت کا راگ الاپتے رہتے ہیں مگر داخلی اور خارجی امور میں فوجی اثر ورسوخ کوواضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد ہمارے فوجی سربراہان ملکی سیاست سے بالواسطہ یا بلاواسطہ منسلک رہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بغیر کبھی اخبار یا خبرنامہ مکمل نہیں ہوا۔جب سے ہماری عدلیہ ''آزاد'' ہوئی ہے ہمارے ''آزاد'' میڈیا نے چیف جسٹس کو بھی آرمی چیف کی طرح عوام میں اتنا مقبول کر دیا ہے کہ اب کسی کی بکری بھی چوری ہو جائے تو وہ چیف جسٹس کو ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔حالانکہ چیف جسٹس نے بحال ہونے کے بعد جتنے بھی بڑے فیصلے کیے ان میں ماسوائے یوسف رضا گیلانی کی قربانی کے کسی بھی فیصلے پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔مرشد چلا گیا اس کی جگہ راجہ آ گیا مگر اس سے عوام کو کیا فرق پڑا؟ یہ بھی عجیب سی بات ہے جہاں لوگوں کو ملک کے چیف جسٹس کے نام کا پتہ نہیں وہاں انصاف کا بول بالا ہے،انصاف سستا ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں مفت اور آسان بھی ہوتا ہے۔مگر وطن عزیز میں آزاد عدلیہ کا مقبول چیف جسٹس عوام کو انصاف فراہم کرنے میں ناکام ہے۔بیچاری آزاد عدلیہ کبھی چینی تو کبھی سی این جی کا ریٹ مقرر کرتی ہے مگر اس پر عمل درآمد ہی نہیں ہوتا۔قانون نافذ کرنے والے اداروں میں بھرتیوں ،ٹرانسفر اور ریٹائرمنٹ میں بھی سیاسی وابستگی کا عمل دخل ہوتا ہے۔کسی علاقے کے تھانیدار سے لیکر آئی جی تک کی ڈور جب سیاسی پنڈتوں کے ہاتھ میں ہوگی تو ملک میں امن وامان کی حالت غریب کے بچے کی طرح ہی ہوگی جو وقت کے ساتھ بد سے بدترین ہوتی جارہی ہے۔ہارس ٹریڈنگ،فلور کراسنگ جیسے الفاظ ہماری قومی زبان کے نہیں مگر ان کا سیاست میں اس قدر استعمال ہوا ہے کہ یہ الفاظ قومی اور سیاسی لگتے ہیں۔جن کی زبان کے یہ الفاظ ہیں وہاں لوگوں کو ان کے معنی بالکل اسی طرح نہیں پتہ جیسے لفظ لوڈشیڈنگ کا۔لوٹا جو طہارت اور وضو کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اسے کوئی سیاسی جماعت اپنا انتخابی نشان کے لیے لینا کبھی پسند نہیں کریں گے کیونکہ لوٹے کا نام لیتے ہی ایسے سیاستدانکا تصور ذہن میں آنا شروع ہو جاتا ہے جو ایک پارٹی سے اپنا حصہ لوٹ کر دوسری پارٹی میں لوٹ مار کرنے چلا جائے۔آخر ہمیں سیاست نے اتنا سحر زدہ کیوں کر دیا ہے؟ آج اگر ترقی یافتہ ممالک کا جائزہ لیا جائے تو وہاں سیاست صرف ان لوگوں کے سپرد کی گئی ہے جو سیاسی بصیرت و بصارت رکھنے کے علاوہ علم وہنر میں اعلی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔جو عوام کی خدمت کے لیے ہر وقت دستیاب ہوتے ہیں کیونکہ وہ عوام میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح نہیں دیتے۔عوام پر حکومت کی بجائے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ان کا نصب العین ہوتا ہے۔ فوج ،عدلیہ ،میڈیا اور ریاست کے دیگر ادارے اپنے کام پر پوری توانائی کے ساتھ کام کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔جن کے ہاتھ میں ملکی باگ ڈور ہوتی ہے وہ اپنا کام نیک نیتی سے کرنے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ادارے سیاسی معاملات میں الجھ کر تصادم کا شکار نہیں ہوتے۔ان حالات میں اگر کسی کو نوٹوں پر کس کی تصویر ہے؟ چیف جسٹس یا آرمی چیف کا پتہ نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمارے ہاں تو ایسا لگتا ہے جو کچھ نہیں کر سکتا تو وہ ''سیاست'' تو کر ہی سکتا ہے۔سیاسی وباء سے چھٹکارے کے لیے شاید ہمیں ویکسین کی ضرورت ہے مگر جس ملک میں پولیو کی ویکسین دینے والوں کو نشان عبرت بنا دیا جائے وہاں سیاسی ویکسین پلانے کے جرم کی سزا کیا ہوگی اس تصور سے ہی روح کانپ اٹھتی ہے۔ملالہ یوسف زئی ہو یا پھر پولیو ٹیم کی خواتین کسی بھی ایسے حملے کی صورت میں دیار غیر میں مقیم پاکستانیوں کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں اور وہ لوگ جن کو ہم اپنے وطن کی فضیلت اور رشتوں کے احترام کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں ہمیں مشکوک نظروں سے

دیکھنا شروع کردیتے ہیں۔جرم ہم نے تو نہیں کیاہوتا لیکن مجرموں سے ہمارا کچھ نہ کچھ تو ملتا ہے۔۔۔نظریات نہ سہی ملک ہی سہی ۔۔۔خیالات نہ سہی مذہب ہی سہی۔۔۔کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

تحریر: سہیل احمد لون
سربٹن۔سرے
sohailloun@gmail.com
20-12-2012.